اردو افسانہ، خطہ جاپان اور تہذیبی عکاسی

Cultural reflection of Japan in Urdu Short Story

حورین تبسم،
اسکالر، شعبہ اردو فیصل آباد
ڈاکٹر طارق ہاشمی،
ایسوسی ایٹ پروفیسر اردو، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد

Abstract:

In Urdu short fiction, it is an interesting factor regarding global phenomena that the writers of fiction have incorporated Japanese civilization, history and culture in a good way. These stories show that Japanese civilization and culture is one of the oldest human civilizations. There is one. The Japanese protected their cultural elements very well. In the context of the Second Great Gang, the whole world is aware of the tragic disaster in Japan, but after this nuclear disaster, the way this nation went on the path of development.

From Saadat Hasan Manto, Qaratul Ain Haider, Ahmad Nadeem Qasmi, Khawaja Ahmad Abbas and Krishan Chandra to the modern fiction writers Hamid Siraj and Ahmad Sagheer, Japanese civilization and history have been described in different ways in their stories.

کلیدی الفاظ: جاپان، تہذیب و ثقافت، افسانہ، ہاراکاری، بونسائی

دنیا کے معاصر منظر نامے میں جاپان ایک ترقی یافتہ ملک کے طور پر ایک معتبر حیثیت رکھتا ہے لیکن تاریخی لحاظ سے یہ خطہ ایک تہذیبی لحاظ سے بھی بہت پُر کشش ہے اور قدیم دنیا کی عظیم ثقافت اور جدید دنیا کی شاندار ترقی کا حسین امتزاج ہے۔ اس ملک کے تہذیبی عناصر نے اُردو ادب کے کئی لکھاریوں کو اپنی طرف راغب کیا۔ ادیبوں نے نہ صرف جاپانی تہذیب و معاشرت کو اپنا موضوع بنایا بلکہ دوسری عالمی جنگ، ہیروشیما اور ناگاساکی جیسے تاریخی واقعات کو موضوع بناتے ہوئے اس وقت کی صورتِ حال اور لوگوں کی نفسیات پر خوب طبع آزمائی کی۔ اُردو ادب کے کئی نامور ادیبوں نے جاپانی تہذیب کے مختلف مظاہر کو موضوع بنایا اور تشبیہاتی و استعاراتی پیرائے میں جاپان کی تہذیب و ثقافت کا ذکر کیا۔

اردو افسانے میں خطہ جاپان کی تہذیبی عکاسی دیکھی جائے تو پہلا قابلِ ذکر نام سعادت حسن منٹو کا ہے جن کے افسانوں میں ہمیں بعض مقامات پر جاپانی تہذیب و معاشرت جھلک عمدہ پیرائے میں نظر آتی ہے۔ ان کا افسانہ ”مجید کا ماضی“ جو عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے ہوئے اپنے ماضی کو یاد کرنے والے ایک ایسے دولت مند شخص کی کہانی ہے جس کے پاس کوٹھی ہے۔ اچھی تنخواہ ہے۔ بیوی بچے ہیں اور ہر طرح کی عیش و عشرت ہے۔ ان سب کے درمیان اس کا سکون نہ جانے کہاں کھو گیا ہے۔ وہ سکون جو اسے یہ سب حاصل ہونے سے پہلے تھا جب اس کی تنخواہ کم تھی، بیوی بچے نہیں تھے۔ کاروبار تھا اور نہ ہی دوسرے مسائل۔ اب سارے عیش و آرام کے بعد بھی اُسے وہ سکون نصیب نہیں ہوتا۔ مجید نامی شخص جو اپنے ماضی کی عیاشی اور شراب نوشی کی عادت کو یاد کرتا ہے اب اس کے پاس عیاشی کے لیے تمام وسائل دستیاب ہیں اور ہر قسم کی شراب موجود ہے، لیکن وہ مزا کہاں جو ہر شام جاپان کی بنی ہوئی شراب پینے میں آتا تھا۔ جاپان میں شراب پینا اور شراب خود تیار کرنا معمولی بات ہے۔ جاپانی مشروبات میں روایتی جاپانی شراب بہت مقبول ہے۔ جاپان میں بنائی جانے والی سب سے زیادہ غیر ملکی شراب ساکورا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

> ”اب اس کے پاس ہر قسم کی شراب موجود رہتی تھی مگر وہ مزا، وہ سرور جو اسے پہلے ہر روز شام کو جاپان کی بنی ہوئی ”اب ہی بیئر“ پینے میں آتا تھا، بالکل غائب ہی ہو گیا تھا۔(1)

اردو افسانے میں خطہ جاپان کی تہذیبی منظر کشی کے سلسلے میں کرشن چندر اپنے افسانے ”چاندی کا کمر بند“ میں جاپان اور جاپانی مذہب کا ذکر ایک ضمنی کردار کے ذریعے کرتے ہیں۔ یہ کردار ”بیرونیس ہوفن“ نامی ایک عورت کا ہے جو مہاتما بدھ سے بے حد لگن رکھتی ہے۔ اور کسی بودھی سوسائٹی کے مدعو کرنے پر جاپان چلی جاتی ہے۔ جاپان میں بدھ مت کے کئی فرقے موجود ہیں۔ اسی لیے بدھ مت کے حوالے سے کوئی سوسائیٹیاں اور کئی تنظیمی ادارے قائم ہیں جو معاشرے میں بدھ مت کی ثقافت کو پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کرشن چندر کے افسانے ”چاندی کا کمر بند“ سے اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ”بیرونیس ہوفن میں ایک عمدہ شکار کی ساری خصوصیات تھیں۔ عمر پچاس سے اوپر، ڈھلتی ہوئی خوب صورتی اور بڑھتی ہوئی خواہشیں۔ مشرقی فلسفے اور آرٹ کی دلدادہ مہاتما بدھ سے اسے عشق تھا۔ میں نے جلدی جلدی بدھ ازم پر بہت سی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ مگر ابھی دو ملاقاتیں ہوئی تھیں کہ وہ جاپان چلی گئی۔ زین فلسفے کا مطالعہ کرنے کے لیے وہاں کسی کسی بودھی سوسائٹی نے اسے دعوت دی تھی۔(2)

جاپانی تہذیب و ثقافت کے حوالے سے کرشن چندر کا ایک اہم افسانہ "میں نے جاپان میں کیا دیکھا" نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ اس افسانے میں جاپانی تہذیب کے کئی ایسے مظاہر کو بیان کیا گیا ہے جن سے جاپانی تہذیب کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔

جاپانی سرزمین چونکہ جزائر پر مشتمل ہے۔ اس لیے اس ملک کا بیشتر حصہ پہاڑوں پر مشتمل ہے۔ افسانے میں یوکوہاما پہاڑ کا ذکر ملتا ہے جس کا شمار جاپان کے بلند ترین پہاڑوں میں ہوتا ہے۔ افسانے میں کرشن چندر جاپانی تہذیب کے اہم ترین پہلو "ہاراکاری" کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ ہاراکاری، خنجر یا چاقو سے پیٹ چاک کر کے رسمی خودکشی کرنے کا عمل ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> "دراصل جاپانیوں کی فکاہی جس پر بہت تیز ہوتی ہے اکثر اسی جس سے مغلوب ہو کر وہ خودکشی بھی کر لیتے ہیں۔ جاپان میں اس قسم کی خودکشیاں آئے دن ہوتی رہتی ہیں۔ جاپانی زبان میں اسے "ہاراکیری" کہتے ہیں۔(3)

جاپانی تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ سمورائی جو جاپانی سماج میں انتہائی موثر اور دلیر انا جنگجو تھے۔ دشمن کے ہاتھوں شکست قبول کرنے کی بجائے عزت کی موت پسند کرتے تھے۔ اس عمل کے لیے باقاعدہ سمورائی کی روایتی تقریب ہوتی تھی۔ سیّد راس مسعود اپنی کتاب "جاپان اور اس کا تعلیمی نظم و نسق" میں سمورائی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "یہی وجہ ہے کہ جاپان کی تاریخ میں بڑار ہا مثالیں اس کی ملتی ہیں کہ لڑائی کے میدان میں اگر سپاہیوں یا اُن کے افسروں کو شکست ہوئی تو انہوں نے فوراً "ہراکیری" (خودکشی) کر کے اپنی جانیں تلف کر دیں، مگر کبھی دشمن کے ہاتھ میں گرفتار ہو کر اسیرانِ جنگ نہ بنے۔(4)

جدید جاپان میں ہاراکاری بہت عام ہے۔ آئے دن خودکشی کے واقعات دیکھنے، سننے کو ملتے ہیں۔ کئی نامور ادیبوں نے بھی سمورائی انداز میں خودکشی کر لی تھی۔ اس افسانے کے دیگر موضوعات میں جاپانی خواتین کی دلیری، جفاکشی اور وطن سے والہانہ محبت قابلِ ذکر ہے۔ مصنف جاپانی خواتین کے روزمرہ معمول اور ان کے رہن سہن کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ جاپانی خواتین وطن کے نام پر جان چھڑکتی ہیں۔ وہ گھر کے تمام کام کاج خود کرتی ہیں اور خاندان کی آمدنی میں اضافے کے لیے کسی دکان یا کارخانے میں ملازمت بھی کرتی ہیں۔

کرشن چندر نے جاپانیوں کے مذہب کو بھی موضوع بنایا۔ عموماً اُردو فکشن میں بدھ مت کا ذکر عام ہے جو جاپانیوں کے قدیم مذاہب میں سے ایک ہے لیکن کرشن چندر نے اپنے افسانے میں جاپانیوں کے دیگر مذاہب کا بھی ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"جاپان والوں کا اپنا کوئی مذہب نہیں۔ وہ یا تو بدھ مت کے پیروکار ہیں جو ہندوستان سے گیا ہے یا شنٹو مت کے جو مشہور چینی مصلح کنفیوشش کے جاری کیے ہوئے مذہب کی نقل ہے۔ عیسائیوں کے گرجے ہیں، آریہ سماج کا ایک مندر ہے، چند مسجدیں بھی ہیں۔(5)

جاپانی مذاہب کے بعد یہ افسانہ ہمیں جاپانی زبان کے بارے میں بھی معلومات فراہم کرتا ہے۔ مصنف بتاتے ہیں کہ جاپانیوں کی اپنی کوئی زبان نہیں اور نہ ہی حروفِ تہجی۔ اقتباس ذیل ہے: "جاپان والوں کی اپنی کوئی زبان نہیں۔ جاپانی زبان دراصل چینی زبان ہی کی ایک شکل ہے اور حروفِ تہجی تو بالکل وہی ہیں۔(6)

اہلِ جاپان کا اپنا کوئی رسم الخط نہیں تھا لیکن کچھ عرصے بعد نئے حروفِ تہجی ایجاد کر لیے گئے تھے۔ چھٹی صدی عیسوی میں جاپانیوں نے چین کے رسم الخط کو اپنے ہاں رائج کیا جسے "کانجی" کہتے ہیں۔ کانجی سے مراد شکلوں اور علامتوں کی زبان ہے اس کے لاتعداد حروف اور علامتوں کی وجہ سے اس کو استعمال کرنے میں جاپانیوں کو دِقت کا سامنا رہا۔ روزمرہ کی عام بول چال کے لیے کانجی کے ہزاروں حروف یاد کرنے پڑتے تھے۔ چنانچہ آٹھویں اور نویں صدی عیسوی میں جاپانیوں نے دو نئے حروف ایجاد کیے۔ ہیراگانا اور کاتاکانا۔

کرشن چندر نے جہاں جاپانی تہذیب و ثقافت کے مختلف مظاہر کا ذکر کیا وہاں جاپانی گیشاؤں کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ "گیشا" روایتی فنکار خواتین ہیں۔ ہمارے ہاں طوائف کا بنیادی ہنر عام طور پر اس کی رقص میں مہارت سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح "گیشا" عمومی جسم فروش نہیں ہوتیں بلکہ یہ جاپانی تہذیب کا ایک تاریخی استعارہ ہیں۔ ان کی مہارتوں میں مختلف قسم کے فنونِ لطیفہ مثلاً کلاسیکی موسیقی، رقص، کھیل اور بات چیت شامل ہیں۔ روایتی لباس میں ملبوس، زبان و بیاں پر دسترس اور ثقافتی نزاکتوں سے مکمل آشنائی رکھنے والی یہ خواتین انتہائی اعلیٰ تربیت یافتہ ہوتی ہیں۔ کرشن چندر کچھ یوں لکھتے ہیں:

"ایک بات مجھے جاپان میں بہت پسند آئی اور وہ جاپانی گیشاؤں کا اخلاق۔ وہ عام طور پر ہندوستانی مغنیوں کی طرح بازو ہلا ہلا کر نہیں گاتیں۔ وہ نہایت سنجیدہ اور متین ہوتی ہیں۔(7)

افسانے کے آخری حصے میں جاپانیوں کی پھولوں سے رغبت کا ذکر ہے۔ جاپانی لوگ پھولوں سے عشق کرتے ہیں۔ پہاڑوں، میدانوں، کھیتوں، سڑکوں کے کناروں، باغیچوں میں غرض جہاں جاؤ ہر طرف پھول ہی پھول نظر آتے ہیں۔ جاپان میں پھولوں کی زیبائش و آرائش باقاعدہ ایک آرٹ ہے۔ مختصر مگر جامع نوعیت کا یہ افسانہ جو کہ سفرنامے کی نوعیت پر مبنی ہے۔ جاپانی تہذیب و معاشرت کا عمدہ عکاس ہے۔

اردو کے جن افسانوں میں جاپانی تہذیب و معاشرت کے مختلف مظاہر تشبیہاتی اور استعارتی طور پر نظر آتے ہیں، ان میں قراۃ العین حیدر کے افسانے "پت جھڑ کی آواز" میں جاپانی شاعری کا تشبیہاتی ذکر ملتا ہے تو

کہیں ان کے افسانے "مونالسا" میں جاپانی چھتری تو کہیں ان کے افسانے "میں نے لاکھوں کے بول سہے" میں جاپانی گلدان میں ذکر ملتا ہے۔ اسی طرح منٹو کے افسانے "دس روپے" میں جاپانی سرخی جبکہ افسانہ "ممد بھائی" میں جاپانی عورت، کرشن چندر کے افسانے "پہلا دن" میں جاپانی لپ اسٹک، بانو قدسیہ اپنے افسانے "یہ رشتہ و پیوند" میں جاپانی کشتی، خواجہ احمد عباس کے افسانے "شکر اللہ کا" میں جاپانی کمبل، نیلوفر کے افسانے "کرسٹل ہاؤس" میں جاپانی گلدان اور نجیبہ عارف کے افسانے "صدیوں بھر الحہ" میں جاپانی شاہی مقبروں کا سرسری ذکر ملتا ہے۔

راجندر سنگھ بیدی کا افسانہ "اغوا" جس میں جاپان میں بھونچال (زلزلے) کا ذکر ہے۔ دنیا بھر میں سب سے زیادہ زلزلے جاپان میں ہی آتے ہیں۔ تسنیم کوثر کے ایک افسانوی مجموعے کا نام "بونسائی" ہے۔ اس مجموعے میں پہلا افسانہ بھی "بونسائی" کے عنوان سے ہے۔ بونسائی جاپانی لفظ ہے۔ یہ پودوں کی آرائش کا ایک جاپانی طریقہ ہے۔ بونسائی جاپان میں "گملے میں شجر" کو کہتے ہیں۔ افسانے میں بونسائی کی نگہداشت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اشفاق احمد کے سائنس فکشن افسانوی مجموعے "طلسم ہوش افزا" میں شامل افسانے "سعید جونیئر" میں سعید جونیئر سعید احمد سے کہتا ہے "میں تمہارا بونسائی ہوں۔" اس کے علاوہ کئی افسانوں میں جاپانی کمپنیوں اور خاص طور پر جاپانی الیکٹرانکس کا ذکر بھی ملتا ہے جن میں شاہ محمد کا تانگہ، ٹیڈی بیئر نے کیا سوچا اور بانگی مرغی جیسے افسانے شامل ہیں۔ غرض جاپانی تہذیب و ثقافت کے مختلف مظاہر کی خوبصورت اور دلکش رنگارنگی ہمیں اُردو افسانوی ادب میں نمایاں جھلکتی نظر آتی ہے۔

بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں پوری دنیا انتشار کا شکار تھی۔ عالمی سطح پر جنگیں ہو رہی تھیں۔ انقلابات رونما ہو رہے تھے جن سے زندگی کا ہر شعبہ متاثر تھا۔ اردو کے افسانہ نگاروں نے جہاں جاپانی تہذیب و معاشرت کو اپنا موضوع بنایا وہاں دوسری عالمی جنگ اور ہیروشیما ناگاساکی جیسے تاریخی واقعات کو موضوع بناتے ہوئے اس وقت کی صورتِ حال اور لوگوں کی نفسیات پر خوب طبع آزمائی کی۔

علی سردار جعفری کا افسانہ "چہرو مانجھی" میں مصنف نے بنگال کے ساحلی علاقوں کا ماحول پیش کیا ہے، کسان غربت افلاس کے سبب اپنی بیٹیوں کو بیچ دیتے ہیں یا ان سے پیشہ کرواتے ہیں۔ اس کے علاوہ جاپان نے جب ہندوستان پر حملہ کیا تو اس دوران ماہی گیروں کی صورتِ حال کا بیان بھی افسانے کا حصہ ہے۔ اس دوران ماہی گیروں کی حالت بہت بدتر ہو گئی تھی۔

ماہی گیروں کو عام طور سے سمندر میں جانے کی اجازت نہیں ملتی تھی۔ اجازت نامے کے لیے فوجی افسروں سے رجوع کرنا پڑتا تھا۔ طویل تگ و دو کے بعد بھی صرف امیر ماہی گیروں کو سمندر میں جانے کی اجازت ملتی تھی کیونکہ غریب افراد رشوت دینے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> "لیکن جب سے لڑائی شروع ہوئی تھی اور جاپان نے ہندوستان پر حملہ کر دیا تھا۔ تب سے ماہی گیروں کو عام طور سے سمندر میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ کھلے سمندر میں جانے کے لیے انہیں فوجی افسروں سے اجازت نامہ حاصل کرنا پڑتا تھا، جو صرف چند امیر ماہی گیروں کو ملتا تھا۔ (8)

ماہی گیروں کی غربت و افلاس کے سبب وہاں کی تمام لڑکیوں نے اپنی عزتیں سپاہیوں پہ لٹانا شروع کر دی۔ سپاہی موٹر گاڑیوں میں گزرتے ہوئے سڑک کے کنارے کھڑی لڑکی کو بٹھالے جاتے۔ افسانے کا مرکزی کردار "چہرو" نامی لڑکی ہے جو تیرہ دن کے فاقے کے بعد ایک سیر چاول کے لیے اپنا جسم بیچ دیتی ہے اور پھر یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے لڑکیوں کے باپ یہ تمنا کرتے ہیں کہ اس گھٹیا پن سے تو اچھا کہ جاپانی ہم پر بم کیوں نہیں گرا دیتے۔ افسانے میں بنگال کے ساحلی علاقوں کی صورتِ حال اور جاپانی حملے کے بعد جاپانیوں کی عائد کردہ پابندیوں میں ماہی گیروں کی صورتِ حال کو حقیقت نگاری سے کام لیتے ہوئے پیش کیا گیا ہے۔

جاپان کی تاریخ میں ہیروشیما اور ناگاساکی کی تباہی ایک الم ناک حادثہ ہے۔ اس تباہی کے تناظر میں بھی ہمیں اردو افسانے میں ایک بڑا ذخیرہ ملتا ہے۔ ادب دائمی اقدار سے سروکار رکھتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے عہد کی سچائیوں کو فراموش بھی نہیں کرتا۔ ان جنگوں کی وجہ سے کئی کہانیاں منظر عام پر آئیں۔

احمد ندیم قاسمی کے افسانے "مامتا" میں غیر ملک کی سرزمین پر اپنی ماں کی یاد میں تڑپتے ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جو پنجاب سے برطانیہ کی فوج میں بھرتی ہوا اور پھر چین کے ایک جزیرے ہانگ کانگ آ گیا۔ یہاں آنے سے قبل اس نے ہانگ کانگ کی امیری کے قصے سن رکھے تھے مگر جب بدحال چینیوں کی شکلیں دیکھی تو اس کے سارے خواب ہوا ہو گئے۔ وہ ہانگ کانگ کی حالت دیکھتا اور اپنی ماں کو یاد کرتا۔

انگریزوں کو شکست کے بعد جاپانیوں نے ہانگ کانگ پر قبضہ کر لیا اور پنجاب سے ہانگ کانگ جانے والے تمام سپاہیوں کو جنگی قیدی بنا لیا۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں: "جاپانیوں کے آنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ وہ آئے اور قابض ہو گئے اور میں جو پنجاب سے ہانگ کانگ میں پولیس کا سپاہی بننے آیا تھا۔ جنگی قیدی بنا دیا گیا۔ (9)

سپاہی جاپانیوں کی تمام سختیاں اور ان کے تمام احکامات کو مانتا ہے اور ان کے حضور کوئی گستاخی نہیں کرتا۔ وہ اس امید پہ جیتا ہے کہ کبھی تو جنگ ختم ہو گی اور وہ اپنی ماں کی آغوش دوبارہ حاصل کرے گا۔ اپنی ماں

سے ملنے کی یہی تمنا تھی کہ وہ جاپانیوں کے برے سلوک کو نہایت عاجزی سے برداشت کرتا ہے۔ جاپانیوں کے دل برداشتہ سلوک کا ذکر افسانے میں کچھ یوں ہے:

> ''میری قمیض کے بٹن ٹوٹ گئے تھے۔ ایک دن ایک جاپانی سے میں نے ایک بٹن کی بھیک مانگی تو اس نے میرے سینے کے بالوں کا ایک گچھا ایک جھٹکے سے توڑ کر میرے ہاتھ میں دے دیا اور کہا ''اسے باندھ لو۔'' ٹوٹے ہوئے بالوں کی جڑوں میں سے پھوٹتے ہوئے خون نے جاپانیوں سے مانوس ہونے کی پہلی منزل طے کرا دی۔(10)

ایک دن جاپانی افسر بتاتا ہے کہ ہانگ کانگ کے قریبی ساحلی جزیرے پر چینی مچھیروں نے جاپانی سرکار کے خلاف محاذ بنالیا ہے۔ چنانچہ جاپانی دستہ قیدی سپاہیوں کے ہمراہ چینی گاؤں پر حملہ کر دیتا ہے۔ حیران کن بات یہ تھی کہ اس جزیرے پہ بوڑھی ادھیڑ عمر عورتیں بڑی تعداد میں جھونپڑوں سے باہر نکل آئیں۔ ان ادھیڑ عمر عورتوں میں سپاہی کو ایک عورت اپنے بیٹے کے انتظار میں تڑپتی ہوئی ملی۔

محمد حامد سراج اپنے ایک افسانے ''گلوبل ولیج'' میں جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کے غلط استعمال پر ایک لطیف طنز کرتے ہیں کہ انسان اپنی صلاحیتوں کو خیر کے کاموں کے لیے بروئے کار لانے کی بجائے تباہی و بربادی کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ اس مسئلہ کو افسانہ نگار نے ہیروشیما اور ناگاساکی پر گرائے گئے بم سے پیدا ہونے والی افراتفری کے پس منظر میں پیش کیا جائے۔ ایٹمی بمباری کی وجہ سے گاؤں کے افراد نابینا ہو جاتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''ہمیں صرف اتنا یاد ہے کہ ہماری بینائی چھن گئی تھی۔ اس وقت کرۂ ارض ایٹم بم کی زد میں تھا۔ دنیا کے سات ممالک نے کامیاب ایٹمی دھماکے کر کے اپنا لوہا منوا لیا تھا۔ ہیروشیما اور ناگاساکی کے بعد پاکستان اور ہندوستان ایٹمی جنگ کے دہانے پر کھڑے تھے۔(11)

افسانے میں ایک ماں اپنے بچے کی بہتر پرورش و پرداخت اس امید پر کرتی ہے کہ وہ بڑا ہو کر مشعلِ راہ ثابت ہو گا مگر سنِ بلوغت کو پہنچنے کے بعد جب وہ دنیا کو شعور کی آنکھوں سے دیکھتا ہے تو پوری دنیا ویران نظر آتی ہے۔ لہٰذا وہ گرم سلائیاں آنکھوں میں پھیر لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ افسانے میں ایٹمی بمباری کے نتیجے میں پیدا ہونے والی پریشان اور مایوس کن صورتِ حال کو بیان کیا گیا ہے۔

عشرت ظہیر کے افسانے ''تماشائی'' کا مرکزی کردار ایک ایسا نوجوان ہے جو خاموش تماشائی کی حیثیت سے گاؤں کی خستہ حال صورتِ حال کا جائزہ لیتا ہے۔ گاؤں میں بیچارگی، تنگدستی، نفرت، افلاس اور محبت کو دیکھتے ہوئے اسے بچپن میں پڑھی ہوئی انگریزی کی ایک کہانی یاد آتی ہے جو جاپان کے شہر ہیروشما سے جڑی ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں: ''وہ چھ جزیروں سے گھرے ہوئے جاپان کے ایک شہر ہیروشیما کی کہانی تھی۔ ۱۶ اگست

۱۹۴۵ء کے دن کا واقعہ تھا۔(12) افسانے میں ہیروشیما میں ایٹمی بمباری کے بعد ہونے والی تاریکی کا سرسری بیان ملتا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

> ''اسی لیے انھوں نے الماری سے ایک کتاب نکالی اور پڑھنے لگے۔ ٹھیک اسی وقت سائرن کی آواز سنائی دی۔ ہوائی جہاز ہیروشیما کے اوپر تھے۔ ہیروشیما پر بم گرایا گیا۔ آسمان پر روشنی کا جھکا ہوا اور فضا میں چمکیلے سورج کی طرح کچھ دکھائی پڑا۔ بڑے زور کا شور ہوا اور گرد و غبار کا بادل اُٹھا اور سورج چھپ گیا اور دن تاریکی میں ڈوب گیا۔(13)

نوجوان گاؤں کی پژمردہ صورتِ حال کو دیکھتا ہے تو اسے ہیروشیما کی ایٹمی بمباری کے بعد کی تباہی یاد آتی ہے۔ بلاشبہ اس ایٹمی بمباری نے ہر طرف تباہی مچائی۔ کئی خاندان برباد ہوئے۔ لاکھوں افراد کی خوشیوں کے چراغ بجھ گئے اور جو زندہ بچ گئے ان کی زندگی ایک زندہ لاش کی مانند تھی۔ ایسے ہی فرد کی ایک کہانی نند کشور وکرم کا افسانہ ''طول شب فراق'' ہے جو جاپان کے مشہور مجسمہ ساز ''ہاتویاما'' نامی شخص کے گرد گھومتی ہے۔ جاپان میں مجسمہ سازی کا فن بہت عام ہے۔ ہاتویاما سرکار کی دعوت پر گاندھی کا مجسمہ بنانے کے لیے بھارت جاتا ہے۔ جاپانی شخص ہاتویاما کی دوستی ''راکی'' نامہ شخص جو کہ آرٹ کا دلدادہ ہے، سے ہو جاتی ہے۔

ایک دن ہاتویاما سگریٹ کے کش لگاتا ہوا نہایت افسردگی اور غم کے گھنے سائے میں اپنے تخیل سے اُلجھا ہوا نظر آیا تو راکی ہاتویاما سے اُس کی اُداسی کا سبب پوچھتا ہے۔ ہاتویاما اُسے بتاتا ہے کہ دوسری جنگِ عظیم کے آغاز میں وہ نیویارک میں تھا اور اس کی بیوی ناگاساکی میں، جب ہٹلر نے یورپ کے کئی ممالک پر حملے کیے تو اس کی بیوی نے جنگ سے گھبرا کر ناگاساکی واپس آنے کا کہا۔ جنگ کے بھڑکتے شعلوں میں ہاتویاما اپنی جان پر کھیل کر ناگاساکی اپنی بیوی اور چند ماہ کے ننھے بچے کے پاس آجاتا ہے۔ ناگاساکی پہنچ کر وہ خوشی خوشی زندگی بسر کرنے لگے۔ لیکن اچانک ایٹمی بمباری نے ہاتویاما کی دنیا اجاڑ دی۔ اس کی بیوی اور ننھا بچہ ایٹمی بمباری کی نذر ہو گئے اور ہاتویاما اپنی ایک ٹانگ گنوا بیٹھا۔ اقتباس دیکھیے:

> ''ناگاساکی پہنچ کر وہ خوشی خوشی اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ زندگی گزارنے لگا۔ لیکن پھر ایک دن اچانک ایٹم بم کے مہلک اور ہولناک دھماکے نے اس کی دنیا اجاڑ کر رکھ دی۔ اس کی بیوی اور بچہ لقمہ اجل ہو گئے۔ وہ اس قیامت خیز حادثے سے بچ تو گیا مگر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک ٹانگ گنوا بیٹھا۔(14)

یاتوہاما اپنی بیوی اور بچے کے بارے میں بتاتے ہوئے گہری سوچ میں غرق ہو جاتا ہے۔ راکی خاموشی توڑتے ہوئے یاتوہاما سے پوچھتا ہے کہ اس کی بیوی اور بچے کی موت کیسے ہوئی؟ یہ سوال یاتوہاما کے لیے بہت اذیت ناک تھا۔ یاتوہاما اپنی بات کا آغاز کچھ یوں کرتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں: ''شاید تم جانتے ہی ہو گے کہ جاپان

کو شکست دینے کے لیے اتحادیوں نے ایٹم بم کا سہارا لیا تھا اور اسی ایٹم بم کے ہیروشیما اور ناگاساکی کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔(15)

یاتوہاما بتاتا ہے کہ رات اطمینان سے ہم سوئے لیکن اچانک ایک زبردست دھماکا سنائی دیا اور اچانک مجھے اپنے اوپر ایک پہاڑ جیساوزن گرتا ہوا محسوس ہوا اور درد و کرب سے میری چیخ نکلی، جس کے بعد مجھے بالکل ہوش نہیں رہا۔ تین دن بعد جب مجھے ہوش آیا تو جسم پر پٹیاں بندھی ہوئی تھی۔ ہوش میں آنے کے بعد میں حالات کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا لیکن بے سود۔ کچھ دن گزرنے کے بعد ڈاکٹروں اور نرسوں نے ایٹمی بمباری کے بعد ہونے والی تباہی کو بیان کیا کہ ناگاساکی پر اتحادیوں نے ایٹم بم گرا دیا تھا جس سے پورا شہر کھنڈرات میں تبدیل ہو گیا ہے۔ ہر طرف تباہی ہی تباہی تھی۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ میری بیوی اور بچہ بھی ہزاروں لوگوں کے ساتھ موت کا شکار ہو گئے ہیں۔ اقتباس دیکھیے:

> ”کئی دنوں کے بعد انھوں نے مجھے بتایا کہ ناگاساکی پر اتحادوں نے ایٹم بم گرایا تھا جس سے سارا شہر کھنڈرات میں تبدیل ہو گیا تھا۔ ہزاروں لوگ لقمہ اجل ہو گئے تھے۔ عورتیں بیوہ ہو گئی تھیں۔ بچے یتیم ہو گئے تھے اور ماؤں کی گودیں سونی ہو گئی تھیں اور جو زندہ بچے تھے ان میں زندگی کا کوئی لطف باقی نہ رہا تھا کیونکہ ان میں سے کسی کی ٹانگ نہیں تھی تو کسی کا ہاتھ نہیں تھا۔ کوئی اندھا ہو گیا تھا تو کسی کا چہرہ انتہائی ڈراؤنا۔(16)

یاتوہاما اپنی زخمی ٹانگ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے دیوانوں کی طرح شہر کے کھنڈرات اور ہسپتالوں میں اپنی بیوی اور بچے کو تلاش کرتا ہے لیکن جب امید دم ٹوٹ گئی تو ان کی موت کا یقین ہو گیا۔ رنج و الم کی داستان کے بعد دونوں ساکت و سامت بیٹھے رہے۔ کچھ دیر بعد راکی اپنے گھر آ جاتا ہے۔ لیکن راکی کی ساری رات یاتوہاما کی اداسی اور پریشانی پر غور کرتے ہوئے گزرتی ہے۔

اگلی صبح راکی چائے پیتے ہوئے سوچتا ہے کہ وہ یاتوہاما کی خیریت دریافت کرنے جائے گا کہ اتنے میں نوکر نے ریڈیو کا سوئچ آن کیا تو پہلی خبر سنتے ہی چائے کا پیالہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ یہ خبر یاتوہاما کی خودکشی کی خبر تھی۔

> ”ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ نئی دہلی کے ایک ہوٹل میں جاپان کے مشہور مجسمہ ساز یاتوہاما نے خودکشی کر لی ہے۔ مرحوم ابھی چند ہفتے ہوئے بھارت سرکار کی دعوت پر گاندھی جی کا مجسمہ بنانے کے لیے تشریف لائے تھے۔(17)

یہ کہانی محض ایک شخص کی کہانی نہیں ہے بلکہ ایٹمی بمباری سے متاثر ہونے والے لاکھوں لوگوں کی کہانی ہے جن کی زندگیاں تباہ و برباد ہو گئیں اور جو لوگ زندہ بچے وہ یاتوہاما کی طرح ایک زندہ لاش بن گئے تھے۔

مذکورہ افسانوں کے علاوہ کئی دیگر افسانوں میں دوسری عالمی جنگ اور ہیروشیما ناگاساکی کا ذکر ملتا ہے جیسے منٹو کے افسانے "گرم سوٹ" میں ایٹمی بمباری کا ذکر ملتا ہے اور قرۃ العین حیدر کے افسانے "آوہ گرد میں بھی جنگی صورتِ حال کا تذکرہ ملتا ہے۔ ایک عالمی تباہی جس کا ذکر کرتے ہوئے ادیبوں نے جنگی صورتِ حال میں تباہ شدہ کئی انسانوں کی دل سوختہ کہانیوں کو قلمبند کیا۔

خطہ جاپان کے حوالے سے اردو افسانے میں بعض سماجی موضوعات کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔ خواجہ احمد عباس کا افسانہ "بنارس کا ٹھگ" ایک ایسے فرد کی کہانی ہے جو بنارس کی سیر کے لیے آتا ہے تو اسے ہر جگہ وارانسی لکھاد کھائی دیتا ہے۔ شہر میں گھومتے ہوئے اُسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شہر میں جہاں ایک طرف بہت امیر لوگ ہیں۔ وہیں دوسری طرف ایسے لوگ بھی ہیں جن کے تن پر کپڑے تک نہیں ہیں۔ ہر طرف مکر و غریب اور چھل کپٹ کی دنیا آباد ہے۔ مفاد پرستی اور خود غرضی آج کے سماج و مذہب کی سب سے بڑی پہچان بن گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس افسانے میں مذہب کی بنیاد پر ہی دھرم شالہ اور مسافر خانے میں رہنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ ایک مذہب کے آدمی کو دوسرے مذہب کے مسافر خانے میں رہنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ سیدھے سادے انسان کو ہوٹلوں میں بھی جگہ نہیں ملتی۔

یہ افسانہ میں جہاں سماج کے ایک اہم مسئلہ کو بیان کرتا ہے وہاں اس افسانے میں جاپانی تہذیب اور قدیم مذہب کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ مسافر سیر کرتے ہوئے سارناتھ کے کھنڈروں تک پہنچ جاتا ہے۔ جہاں وہ بدھ مذہب کی مورتی دیکھتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> "مگر مسافر وہاں سے بہت دور سارناتھ کے کھنڈروں میں گھوم رہا تھا۔ جاہں نہ سیٹھ آتے ہیں نہ مولانا۔ نہ موٹروں میں گھومنے والے منتری۔ یہاں خاموشی تھی، سکون تھا۔ ماضی کی دھول پر چلتے ہوئے پروں کی آواز بھی نہ ہوتی تھی۔
>
> بڑی دیر تک مسافر عجائب گھر میں بھگوان بدھ کی مورتی کے سامنے کھڑا رہا اور گوتم کا ابھے مدرا اُسے جیسے دلاسہ دیتا رہا۔(18)

اس کے بعد مسافر مہاتما بدھ کی زندگی کے مختلف مناظر پر مبنی تصویریں دیکھتا ہے جو کہ جاپان کے ایک مہان کلاکار کی بنائی ہوئی تھیں۔ اقتباس ملاحظہ کریں:

> "پھر مسافر نے دیکھا کہ چاروں طرف بھدی بھدی تصویریں بنی ہوئی ہیں، جن میں مہاتما بدھ کی زندگی کے مختلف مناظر پیش کیے گئے ہیں۔ بھکشو نے کہا یہ تصویریں جاپان کے ایک مہان کلاکار نے اپنی شردھا سے بنائی ہیں۔ پورے چار برس لگے تھے اُسے یہ کام پورا کرنے میں۔ وہ دیکھو کونے میں جاپانی آرٹسٹ کا پورا نام پتہ لکھا ہوا ہے۔(19)

مسافر ان تصویروں کو غور سے دیکھتا کہ اچانک اسے پتہ چلتا ہے کہ گوتم بدھ کی مورتی پر آٹھ من سونے کا خول چڑھا ہوا ہے۔ سونے کی مورتی دیکھ کر اسے بہت غصہ آتا ہے اور وہ مورتی توڑ دیتا ہے۔ وہ شہر میں اسی طرح کے کئی تخریبی کام کرتا ہے۔ افسانے کے آخر میں اسے پولیس پکڑ لیتی ہے اور پاگل خانے کو سونپنے وقت جب اس کا نام پوچھا جاتا ہے تو وہ اپنا نام کبیر بتاتا ہے۔ مصنف نے انسان کے دوغلے کردار کی نشاندہی کروانے کے دوران جاپانی تہذیب و معاشرت کا سرسری ذکر کیا ہے۔

اقتباسات سے واضح ہے کہ جاپان فن مصوری کے حوالے سے اپنی ایک منفرد پہچان رکھتا ہے۔ جاپان میں فن مصوری کی تاریخ خاصی پرانی ہے۔ خرم سہیل اپنی مرتب کردہ کتاب ''سرخ پھولوں کی سبز خوشبو'' میں درج کرتے ہیں: ''جاپانی فنِ مصوری اپنی ساخت اور فنی اعتبار سے اس قدر حسین مرقعوں پر مشتمل ہے کہ بس دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ فن گزشتہ ۱۶۰۰ برس سے جاپانی ثقافت اور فنونِ لطیفہ کا جزولاینفک ہے۔(20)

عالمی شہرت کے حامل جاپان کے فنِ مصوری نے انیسویں صدی کے اواخر میں مغرب کے جدید آرٹ پر اثرات مرتب کیے اور ایساتب ہوا جب جاپان نے اپنے دروازے دنیا کے لیے کھولے جس کے نتیجے میں جاپانی مصوری کے کئی شاہکار مرکزِ نگاہ بنے۔ جدید جاپان میں مختلف رجحانات کے تحت فن مصوری کو روز افزوں فروغ حاصل ہو رہا ہے۔

افسانے میں بدھ مذہب کا ذکر بھی ہے جو کہ جاپانیوں کے قدیم مذاہب میں سے ایک ہے۔ جاپان کا قدیم ترین مذہب شنٹو ہے۔ شنٹو کے بعد بدھ مذہب ۵۵۰ء سے ۵۷۵ء کے درمیان متعارف ہوا۔ شنٹو کی طرف بدھ مت بھی جاپان میں مقبول و مستحکم ہے۔

مشرف عالم ذوقی کا افسانہ ''بھنور میں ایلس'' ہے جس میں جاپانی ادب کے بیانیے کی سرسری سی جھلک نظر آتی ہے۔ افسانے میں ایلس نامی لڑکی ایک کتاب کا مطالعہ کر رہی ہے جو ایک جاپانی ناول ہے۔ افسانے میں اس کا ذکر کچھ یوں ہے:

> ''چڑیا کی طرح چہچہائی۔۔۔ جاپانی ناول ہے میں اب تک سمجھتی تھی کہ یہ جاپانی کمبخت ایجادوں کے سوا اور کچھ جانتے ہی نہیں۔ چھوٹے ٹھگنے قد والے۔ ان کے دماغ میں دنیا کو جنت بنانے والے سپنے ہی بستے ہوں گے مگر دیکھو نا کتنی عمدہ کہانی ہے۔(21)

اس افسانے میں مشرف عالم ذوقی جاپان کے معروف شہر ٹوکیو کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ ان افسانوں کے علاوہ اُردو فکشن کے کئی افسانوں میں جاپانی تہذیب و معاشرت کے مختلف مظاہر تشبیہاتی اور استعارتی طور پر نظر

آتے ہیں۔ ندر کی سونامی اپنارُخ بدلتی ہے اور وہ واپس ٹوکیو آجاتی ہے اور اپنی بقیہ زندگی اس یتیم خانے میں پلنے والے بچوں کی خدمت کے لیے وقف کر دی جہاں وہ پل کر جوان ہوئی تھی۔

اخلاق احمد کا افسانہ ”ایک کہانی کا بوجھ“ عرفان نامی شخص کی کہانی پر مشتمل ہے جو ”خان بہادر اینڈ کمپنی“ میں ملازمت کرتا ہے اور کمپنی کی ترقی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ عرفان کمپنی کے مالک خان بہادر عنایت اور اُن کے بیٹے وجاہت خان کی حکمتِ عملی سے کمپنی نے بہت تیزی سے ترقی کی۔ اسی دوران ”زیبی“ نامی خوبصورت اور نہایت ذہین لڑکی کمپنی کا حصہ بنتی ہے اور ہو بہو عرفان کی طرح اپنی ذہانت اور حکمتِ عملی کی بنیاد پر کمپنی میں ترقی کرتی ہے۔کچھ عرصے بعد خان بہادر عنایت دل کا دورہ پڑنے کی وجہ سے دنیا سے رخصت ہو گئے جس کی وجہ سے وجاہت خان شدید صدمے کی حالت میں چلے گئے۔ عرفان بھی اس صدمے سے دوچار تھا لیکن زیبی دونوں کا حوصلہ بنتی ہے۔ زیبی کی ذہانت اور خوبصورتی کو دیکھتے ہوئے عرفان کے دل میں زیبی کے لیے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔کچھ عرصے بعد وجاہت باپ کے صدمے سے سنبھلا تو عرفان اور وجاہت نے کمپنی کے لیے تگ و دو کرنا شروع کر دی۔ وجاہت عرفان کو پارٹیوں سے ملنے سعودی عرب اور دبئی جانے کو کہتا اور ساتھ ہی ساتھ نئی مشینوں کے لیے جاپان جانے کا کہتا ہے۔

جاپان چونکہ ٹیکنالوجی اور مشینری کے لیے دنیا بھر کے روایتی لباس ”کیمونو“ کا ذکر بھی اس افسانے میں نظر آتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے: ”دو ماہ بعد لوٹ رہے ہو مجھے تو یقین ہو چلا تھا کہ ٹوکیو میں کیمونو پہننے والی کسی حسینہ نے تمہیں گرفتار کر لیا ہے۔ میں نے کہا۔ حسینہ نے گرفتار تو کیا ہے مگر وہ کیمونو نہیں پہنتی۔(21)

جاپان میں عورتوں کا روایتی لباس کیمونو ہے۔ اکثر کیمونو محض رسمی تقریبات میں پہنے جاتے ہیں۔ کیونکہ اسے پہن اور پیچھے گدی باندھ کر کام کرنے میں خاص دشواری ہوتی ہے۔ بہر حال جاپانی عورت جب یہ روایتی رنگارنگ ریشمی لباس پہنتی ہے۔ تو واقعی اپسرا معلوم ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ بالوں کے جوڑے کا انداز بھی الگ ہوتا ہے اور جوتے بھی اور چال بھی خاص ہوتی ہے۔

طارق مرزا کا افسانہ ”سونامی“ بہت اہم ہے۔ طارق مرزا نے کئی ممالک کا سفر کیا جن میں جاپان بھی شامل ہے۔ وہ چونکہ جاپانی تہذیب و ثقافت سے آشنا ہیں اس لیے ان کی تحریروں میں جاپانی تہذیب و ثقافت نمایاں نظر آتی ہے۔ سونامی ایک جاپانی لفظ ہے جو کہ دو لفظوں کا مجموعہ ہے۔ ”سو“ کے معنی ساحل اور بندرگاہ کے ہیں جبکہ ”نامی“ کے معنی بلند یا اونچی کے ہیں۔افسانے کی کہانی ایک جاپانی خاندان کی کہانی ہے۔ یہ کہانی ”اینا“ نامی لڑکی کے گرد گھومتی ہے جس کی زندگی میں خوشی محض چند دنوں کی مہمان بن کر آتی ہے۔ اینا کا باپ ماہی گیر تھا۔ جاپان میں یہ پیشہ بہت عام ہے کیونکہ جاپانی کھانوں کا جب بھی تذکرہ ہو تو اُبلے چاولوں کے ساتھ

مچھلی کا استعمال جاپانیوں کے ہاں لازم و ملزوم ہے۔ افسانے میں طارق مرزا مچھلی کے استعمال کا تذکرہ کچھ یوں کرتے ہیں: "ہم جاپانی مچھلی بہت ذوق و شوق سے کھاتے ہیں۔ روزمرہ کے کھانوں میں مچھلی کا جتنا استعمال جاپان میں ہوتا ہے اتنا کسی ملک میں نہیں ہوتا۔(23)

اینا کا باپ ماہی گیری کے پیشے سے اچھا خاصا کما لیتا تھا۔ جس سے وہ ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ایک دن اچانک سمندر میں کشتی اُلٹنے کی وجہ سے اینا کا باپ مر جاتا ہے جس کے بعد اینا اور اس کی ماں کی زندگی رنج و الم تک محدود ہو کے رہ جاتی ہے۔

اینا کی ماں حسین و جمیل اور جوان تھی۔ گاؤں کے لوگ اور برادری والوں کے بہت زیادہ اصرار پر اینا کی ماں کی دوسری شادی ہو جاتی ہے جس سے اینا کی ماں بالکل خوش نہ تھی۔ اینا کا سوتیلا باپ شراب نوشی کرتا تھا۔ جاپان میں شراب نوشی بہت عام ہے۔ "جاپان میں شراب عام ہے سبھی پیتے ہیں لیکن جانجی جیسے لوگ اس میں اتنے غرق ہو جاتے ہیں کہ کسی اور کام کے قابل نہیں رہتے، اور جو اتو گھر کے گھر تباہ کر دیتا ہے۔(24)

دوسری شادی نے اینا کی ماں کی زندگی میں مزید تلخیاں گھول دیں۔ ایک دن اینا کی آنکھ گھر میں شور کی آواز سے کھلتی ہے تو دیکھتی ہے کہ گھر میں پولیس ہے اور اسے پتہ چلتا ہے کہ اس کی ماں نے اسی سمندر میں خودکشی کر لی جہاں اس کے باپ کی جان گئی تھی۔ ماں کی وفات کے بعد گاؤں والے اینا کو نوکیو کے یتیم خانے کے حوالے کر دیتے ہیں جہاں ضروریاتِ زندگی کی تمام سہولتیں ہونے کے باوجود وہ ہمیشہ اپنے ماں باپ کی یاد میں کڑھتی رہتی۔ رفتہ رفتہ اینا نے جینا سیکھا اور آئی ٹی کی ڈگری کے بعد ملازمت شروع کر دی۔ وہ سال میں ایک مرتبہ اپنے گاؤں ضرور جاتی تھی اور اسی چٹان پر کھڑی ہو جاتی تھی جہاں سے اس کی ماں نے خودکشی کی تھی۔ کئی بار وہ سوچتی کہ اسے بھی خودکشی کر لینی چاہیے لیکن وہ ایسا نہیں کرتی۔ جاپان میں خودکشی کرنے کے عمل کو "ہاراکاری" کہتے ہیں۔ گزشتہ ایک اقتباس کی وضاحت میں، مَیں نے ہاراکاری کی مختصراً وضاحت کی تھی لیکن اس افسانے میں طارق مرزا جاپان میں خودکشی کے حوالے سے کچھ یوں لکھتے ہیں:

> "جاپان میں خودکشی عام ہے۔ خودکشی یہاں جرم نہیں ہے اور نہ ہی اسے برا فعل سمجھا جاتا ہے اس کے برعکس خودکشی بہادری اور دلیری کا کام سمجھا جاتا ہے جو جتنا اذیت ناک طریقے سے اپنی جان لیتا ہے وہ اتنا ہی بہادر سمجھا جاتا ہے۔ ہر سال تیس پینتیس ہزار جاپانی اپنے ہاتھوں سے اپنی جان لے لیتے ہیں۔(25)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"ہر سال ہزاروں لوگ مختلف انداز میں اپنی جان دے دیتے ہیں۔ بعض زہر پی لیتے ہیں کئی تیز دھار آلات سے اور کئی بلند مقامات سے چھلانگ لگا کر موت کو گلے لگا لیتے ہیں۔ جاپان کے چند ایک مقامات خودکشی کرنے کے لیے بہت مشہور ہیں۔(26)

اقتباسات سے جاپان میں خودکشی کرنے کی روایت واضح ہے۔ جاپان میں چند ایک مقامات خودکشی کے لیے مشہور ہیں جن میں جاپان کا پُراسرار جنگل "اوکی لگارا" بھی ہے۔ ماؤنٹ فوجی کے قریب واقع یہ قدیم جنگل خودکشی کرنے کے لیے دنیا کی دوسری بڑی جگہ ہے۔

افسانے کی کہانی کچھ یوں ہے کہ اینا کی غمزدہ زندگی میں تازہ ہوا کا جھونکا اس وقت آیا جب وہ نوری سے ملتی ہے۔ نوری اور اینا ایک ہی دفتر میں ملازم تھے۔ کچھ عرصے بعد نوری اور اینا شادی کر لیتے ہیں۔ اینا کی خوشیاں مزید دوبالا ہو گئیں جب اس کے آنگن میں ایک ننھی پری جنم لیتی ہے۔

زندگی نے پلٹا کھایا اور اینا کی زندگی میں ایک بار پھر طوفان آ گیا۔ یہ ۲۰۱۱ء کا سونامی تھا جس نے کئی جاپانیوں کی طرح اینا کا گھر بھی اُجاڑ دیا۔ اینا کا شوہر اور اس کی جان سے زیادہ پیاری بیٹی اس سونامی کی نذر ہو گئے۔ یہ صدمہ اتنا شدید اور گہرا تھا کہ اینا اپنی ماں کی طرح خودکشی کرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ اینا اُسی چٹان پہ پہنچ جاتی ہے جہاں اس کی ماں نے خودکشی کی تھی۔ اینا نے آنکھیں بند کر لی۔ اب وہ چھلانگ لگانے ہی لگی تھی کہ اچانک اُسے ایک تیز اور واضح آواز سنائی دیتی ہے "ماں"۔ اینا نے یہ آواز اتنی واضح سنی تھی کہ اُسے مکمل یقین تھا کہ وہ اس کی بیٹی کی آواز ہے جو اسے پکار رہی ہے۔

ہر زمانے میں اہلِ فن نے اپنی تخلیقات و نگارشات کے لیے نت نئے تجربات سے خود کو دوچار کیا اور بلاشبہ نئے اور حقیقی اظہار و بیان نے ہی ہمیشہ شرفِ قبولیت حاصل کیا۔ احمد صغیر کے افسانے بھی حقیقت و مقصدیت کے حامل ہونے کے باوجود حیات و زیست کے نئے تقاضے اور مطالبے کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کا افسانہ "منڈیر پر بیٹھا پرندہ" ان حقائق کی بہترین علامت ہے۔ کہانی کی تفصیل میں جانے کی بجائے ان امور کو ہی سمجھ لینا کافی ہے کہ اٹھارویں صدی سے لے کر اب تک استعماریت و سامراجیت کے جبر، ظلم و ستم اور استحصال کے ردِ عمل میں جیسے جیسے حادثات اور انقلابات رونما ہوئے وہ تاریک عالم کے سیاہ ابواب ہیں۔

احمد صغیر اس کہانی میں درپردہ سامراجیت، شعبدہ بازی، دہشت زندگی، خوف و ہراس کی فضا اور استحصالی صورتِ حال کے خلاف شائستہ اور محتاط احتجاجی رویہ اپناتے ہیں۔ ان کا یہ طرزِ اظہار علاماتی، استعاراتی اور

رمزیاتی ہے۔ احمد صغیر کے اس طرزِ اظہار اور احتجاجی رویے کے بارے میں ڈاکٹر نسیم ابن صمد ایک محاکے میں لکھتے ہیں:

"اس افسانے میں وہ علاماتی، استعاراتی اور رمزیاتی اسلوب و انداز اور کہانوی طرزِ اظہار کو اپنا کر اپنی احتجاجانہ آواز بلند کرنے میں تقریباً زیادہ کامیاب رہے ہیں۔ ان کے احتجاج کا طریقہ روایتی نہیں بلکہ درایتی، علاماتی، استعاراتی، تمثیلی اور رمزیاتی ہے جو فہم و ادراک سے بالاتر نہیں اور ذہنی فراست و گرفت اور اس کی دسترس سے خارج بھی نہیں۔(27)

احمد صغیر موجودہ نظام سامراجیت کی فکر اور اس کے خاتمے کے لیے ان الفاظ میں گویا ہیں:

"یہ ترقی ہمارے کسی کام کی نہیں، ہماری بلندی ہی ہماری پستی کی علامت ہے اور اب میری آنکھیں کوئی دوسرا ہیروشیما نہیں دیکھنا چاہتیں!

لیکن دیکھ رہی ہیں!

کسی نہ کسی شکل میں!

اور دیکھتے دیکھتے ایک دن یہ آنکھیں بھی پتھر ہو جائیں گی پھر ایٹم بم اسے ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا۔۔۔ لیکن وہ پرندہ۔۔۔(28)

بلاشبہ احمد صغیر نے ایک عالمی تلخ صداقت اور سچائی کو رمزیہ طرز و ادا کے ساتھ بڑے بے باکانہ اور جرأت مندانہ طور پر پیش کیا ہے۔

اردو افسانے میں عالمی مظاہر کے حوالے سے یہ دلچسپ عنصر ہے کہ افسانہ نگاروں نے جاپانی تہذیب، تاریخ اور ثقافت کو اپنے اندر عمدہ انداز میں سمویا ہے۔ ان کہانیوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جاپانی تہذیب و ثقافت قدیم ترین انسانی تہذیبوں میں سے ایک ہے۔ جاپانیوں نے اپنے تہذیبی عناصر کی خوب حفاظت کی۔ اس کے علاوہ جاپان میں ہونے والی الم ناک تباہی سے پوری دنیا واقف ہے لیکن اس ایٹمی تباہی کے بعد یہ قوم جس طرح ترقی کی راہ پر گامزن ہوئی اس کی نظیر نہیں ملتی، اردو افسانوی ادب میں ہمیں اس خطے کی تہذیب و معاشرت کے ایسے کئی مظاہر کی عمدہ اور دلکش رنگارنگی نمایاں جھلکتی نظر آتی ہے۔

حوالہ جات و حواشی

1۔ https: www.rekhta.org

2۔ کرشن چندر، آدھے گھنٹے کا خدا، (دہلی: سٹار پبلی کیشنز، 1969ء) ص 131

3۔ کرشن چندر، ہوائی قلعے (لاہور: اتحاد پرنٹنگ پریس، 1940ء،) ص 175-176

4۔ سید راس مسعود، جاپان اور اس کا تعلیمی نظم و نسق، مترجم: محمد عنایت اللہ (دہلی: انجمن ترقی اُردو، 1927ء) ص 16

5۔ کرشن چندر، ہوائی قلعے، لاہور: اتحاد پرنٹنگ پریس، 1940ء، ص 177-178

6۔ ایضاً، ص 178

7۔ ایضاً، ص 180

8۔ محمد فیروز، ڈاکٹر، سردار جعفری کی نادر تحریریں (دہلی: ساقی بک ڈپو، 2008ء) ص 128

9۔ احمد ندیم قاسمی، سناٹا (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2007ء) ص 94

10۔ ایضاً، ص 95

11 https: www.rekhta.org

12۔ عشرت ظہیر، خوابوں کا قیدی (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2019ء) ص 68

13۔ ایضاً، ص 68

14۔ نند کشور وکرم، آدھا سچ (دہلی: پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزر، 2007ء) ص 121

15۔ ایضاً، ص 122

16۔ ایضاً، ص 123

17۔ ایضاً، ص 127

18۔ رام لعل، خواجہ احمد عباس کے منتخب افسانے، سیمانت پرکاشن (نئی دہلی: دریاگنج، 1988ء) ص 98

19۔ ایضاً، ص 99

20۔ خرم سہیل، مرتب، سرخ پھولوں کی سبز خوشبو (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2012ء) ص 278

21۔ مشرف عالم ذوقی، نفرت کے دنوں میں (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2013ء) ص 324

22۔ https: www.rekhta.org

23۔ https: www.rekhta.org

24۔ https: www.rekhta.org

25۔ https: www.rekhta.org

26۔ https: www.rekhta.org

27۔ نسیم ابن صمد، ڈاکٹر، منڈیر پر بیٹھا پرندہ، ایک محاکمہ (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2010ء) ص 25

28۔ احمد صغیر، منڈیر پر بیٹھا پرندہ، (نئی دہلی: تخلیق کار پبلی کیشنز، 1995ء) ص 12